۲) شرائطِ ملازمت اور حقوق و مراعات کے باب میں شرعی عدالت کے جج صاحبان کا معیار موجودہ دنیا کے مروّجہ اور مسلّمہ معیارات (جو خود ہمارے ملک میں بھی دوسری عدالتوں کے ضمن میں رائج ہیں) سے کم تر رکھا، جس سے ان شبہات کو تقویت حاصل ہوئی کہ درحقیقت یہ سارا کھیل اپنی سیاسی مصلحتوں اور مقاصد کے تحت کھیلا جا رہا ہے۔ اور

۳) سب سے بڑھ کر یہ کہ "وفاقی شرعی عدالت" کے دونوں ہاتھوں میں دو ہتھکڑیاں بھی پہنا دیں، اور دونوں ٹانگوں میں دو بیڑیاں بھی ڈال دیں ــــــ یعنی ایک جانب دستورِ پاکستان اور عدالتی قوانین کو اس کے دائرہ کار سے باہر قرار دے دیا تو دوسری جانب مالی معاملات، اور حد یہ ہے کہ عائلی قوانین تک کو اس کی "دستبرد" سے محفوظ کر دیا اور اس طرح گویا پورے ملک اور پوری قوم کو اس پوزیشن میں کھڑا کر دیا جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ﴾

"تو کیا تم (ہماری) کتاب کے کچھ حصّے کو مانتے ہو اور کچھ حصے کو نہیں مانتے؟ تو جان لو جو لوگ یہ روش اختیار کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ذلت اور رسوائی میں مبتلا کئے جائیں، اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں!" (اعاذنا اللہ من ذلک)

قصہ مختصر، اگر ہماری نیت اور ارادہ پاکستان میں فی الواقع ایک حقیقی اسلامی ریاست قائم کرنے کا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ ملک کے دستورِ اساسی کی نافذ العمل اور واجب العمل دفعات میں قراردادِ مقاصد کو دفعہ ۲ کی حیثیت دینے کے فوراً بعد اس دفعہ کو شامل کیا جائے کہ "یہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کو ہر معاملے میں مطلق بالادستی حاصل ہوگی اور کسی بھی سطح پر کوئی قاعدہ یا قانون ایسا نہیں بنایا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے منافی ہو!" اور اس کی عملی تنفیذ کا یہی راستہ اختیار کیا

© rasailojaraid.c

جائے کہ ہر شہری کو حق حاصل ہو کہ اس پہلو سے کسی بھی معاملے میں اعلیٰ عدالتوں کے در پر دستک دے سکے اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ اس اصول کی بنیاد پر کسی بھی قانون یا قاعدے کو جزوی یا کلی طور پر کالعدم قرار دے سکے!

البتہ یہ ظاہر ہے کہ بحالاتِ موجودہ اس ''کڑوی گولی'' کا نگلنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک وقوم کے خواص وعوام کی معتد بہ اور مؤثر تعداد اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونے اور مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا عزمِ مصمم کرلے اور بحیثیت مجموعی قوم میں اسلام کے حق میں ایک ''مجموعی ارادہ'' (Collective Will) نہ صرف پیدا ہو جائے بلکہ بالفعل ظہور کر کے جانی و مالی قربانیوں کے ذریعے اپنا لوہا منوا لے۔ اور چونکہ تا حال ملک کی بیشتر مذہبی جماعتوں نے' بجائے اس کے کہ اپنی جملہ مساعی کو اسی ایک نکتے پر مرکوز کرتیں' انہیں کشاکشِ اقتدار کے میدان میں ضائع کیا ہے' لہٰذا نفاذِ شریعت کے ساتھ جو مذاق ضیاء الحق مرحوم نے متذکرہ بالا صورت میں کیا تھا اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر نام نہاد شریعت بل کے ذریعے شریعت کی جو مٹی آئی جے آئی کی حکومت کے ہاتھوں پلید ہوئی وہ تو ع ''جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری!'' کے مصداق اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔

جدید اسلامی ریاست میں قومیت کا مسئلہ

عہد حاضر میں ''قومیت'' کا ایک تصور تو وہ ہے جسے انگریزی میں نیشنلٹی (Nationality) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عربی میں ''جنسیت'' سے۔ یہ ایک خالص انتظامی معاملہ ہے جو صرف ملک سے باہر جانے کے لئے ''جوازِ سفر'' یعنی پاسپورٹ میں اندراج کے کام آتا ہے۔ (واضح رہے کہ عربی زبان میں پاسپورٹ کو واقعتاً ''جوازِ سفر'' ہی کہا جاتا ہے اور اس لفظ کے حوالے سے جو شعر مجھے ہمیشہ یاد آجایا کرتا ہے' اور جو عہد حاضر کے بہت سے رہنماؤں پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے' قارئین کی تفننِ طبع کے لئے پیش خدمت ہے۔ ''تری رہبری کا یہ فیض ہے' قدم اہل شوق کے رک گئے۔ نہ کوئی جوازِ سفر ملا نہ کوئی دلیل قیام ہے!'') اس معنی میں

© rasailojaraid.com

ہندوستان میں بسنے والا ہر انسان خواہ مسلمان ہو یا ہندو اور عیسائی ہو یا پارسی ''ہندی'' (انڈین) کہلاتا ہے اور اسی طرح پاکستان میں آباد ہر انسان خواہ کسی بھی صوبے میں رہائش پذیر ہو، پھر خواہ کسی بھی نسل سے تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی مذہب یا مسلک سے منسلک ہو ''پاکستانی'' قرار پاتا ہے۔ بہر حال قومیت کا یہ تصور ایک انتظامی ضرورت ہونے کے اعتبار سے ''مباح'' ہے اور اس میں دینی اعتبار سے کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن ''قومیت'' کے مسئلے کا دوسرا پہلو خالص نظریاتی اور فلسفیانہ ہے۔ چنانچہ عہد حاضر کا مشہور و معروف اور مقبول و محبوب نظریہ تو وہ ہے جسے ''وطنی قومیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی رو سے کسی ملک میں رہنے والے تمام انسان خواہ وہ اس کے کسی بھی حصے یا علاقے میں آباد ہوں، پھر خواہ کسی بھی نسل سے متعلق ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں اور خواہ کسی بھی عقیدے یا مذہب کے پیروکار ہوں، کم از کم دستوری اور قانونی اعتبار سے ان کے جملہ ''حقوق'' بالکل ''مساوی'' ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اس وقت پوری دنیا میں ''نیشن سٹیٹ'' کا یہ تصور پوری طرح چھایا ہوا ہے لہٰذا اس سے مختلف کسی بات کو نہ صرف یہ کہ ذہن آسانی کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر غور کرنے کے لئے بھی بمشکل ہی آمادہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ تصور ''اسلامی ریاست'' ہی نہیں، کسی بھی نظریاتی ریاست کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی نظریاتی معاشرے میں اگرچہ نسل، رنگ اور زبان کی بنا پر تو انسانوں کے مابین کوئی تقسیم یا تفریق نہیں ہوتی، لیکن ظاہر ہے کہ خود نظریئے کی اساس پر تو ایک امتیاز قائم ہوتا ہے اور اس کی بنا پر ریاست کے نظام کو بالفعل چلانے کی اصل ذمہ داری اور اس کی اعلیٰ ترین سطح پر پالیسی کی ترجیحات طے کرنے کے معاملے میں ایک فرق اور تفاوت بہر حال وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ''اسلامی ریاست'' میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا دستوری اور آئینی سطح پر، حقوق اور اختیارات کے اعتبار سے بالکل ''مساوی'' ہونے کا تصور نہ صرف یہ کہ قطعاً غیر منطقی اور غیر معقول ہے، بلکہ بجائے خود ''اسلامی ریاست'' کے بنیادی تصور کی کامل نفی کے مترادف ہے۔

© rasailojaraid.c

اس مسئلے کے خالص علمی اور نظری پہلو سے قطع نظر' خاص طور پر پاکستان کا معاملہ تو یہ ہے کہ یہ قائم ہی وطنی قومیت کے متذکرہ بالا معروف تصور کی نفی پر ہوا ہے۔ اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین اصل نزاع ہی یہ تھا کہ کانگریس وطنی قومیت کے نظریئے کی علمبردار تھی جبکہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی دعوے دار تھی۔ اور مسلمانوں کی قومیت کی اساس ان کے جداگانہ نظریات وعقائد' زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ان کے علیحدہ قوانین وضوابط اور فی الجملہ ان کی جداگانہ تہذیب و ثقافت کو قرار دیتی تھی۔ چنانچہ ''مسلم قومیت'' کی اسی اساس پر حصولِ پاکستان کی تحریک چلائی گئی' جو کامیاب بھی اسی لئے ہوئی کہ مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے احساسات وجذبات کی صحیح ترجمانی کی تھی۔ گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ ؎

''اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!''

اگرچہ نظری اور اصولی طور پر تو پوری امت مسلمہ اور جملہ مسلمانانِ عالم پر منطبق ہوتا ہے' تاہم واقعاتی اور تاریخی اعتبار سے بھی کم از کم پاکستان پر تو صد فی صد صادق آتا ہے' اس لئے کہ اس نے تو گویا جنم ہی اس نظریئے کے بطن سے لیا ہے کہ ؎

''ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!''

لہٰذا اس ملک میں وطنی قومیت کے نظریئے کا عملی نفاذ منطقی اعتبار سے خود اس کے وجود ہی کی نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ واضح رہنا چاہئے کہ منطق کی تلوار بڑی بے رحم ہوتی ہے اور اس عالمِ اسباب میں جو شے اپنا منطقی جواز کھو بیٹھے وہ جلد یا بدیر اپنا وجود بھی کھو بیٹھتی ہے اور بالآخر معدوم ہو کر رہتی ہے!

اس جملہ معترضہ سے قطع نظر' اسلامی ریاست میں اگرچہ بعض بنیادی حقوقِ شہریت میں تو مسلم اور غیر مسلم سب برابر کے شریک ہوں گے' لیکن دو سطحوں پر غیر مسلموں کی شرکت وشمولیت عقلی اعتبار سے غیر منطقی اور اخلاقی اعتبار سے محض دھوکا اور

© rasailojaraid.com

فریب کے مترادف ہے۔ یعنی:

۱) ''قانون سازی'' کو اگر حق قرار دیا جائے تب بھی' اور ذمہ داری سے تعبیر کیا جائے تب بھی' یہ اسلامی ریاست میں صرف مسلمانوں کے کرنے کا کام ہے۔ اس میں کسی غیر مسلم کی شرکت یا شمولیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چنانچہ قانون سازی کو اگر حق سمجھا جائے' جیسا کہ عہدِ حاضر میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے' تب بھی چونکہ اسلامی ریاست میں قانون کا اصل منبع قرآن اور سنت رسول ﷺ ہیں لہٰذا جو لوگ نہ قرآن پر ایمان رکھتے ہوں نہ رسول اللہ ﷺ پر' انہیں یہ حق کسی بھی دلیل کے تحت نہیں دیا جا سکتا۔ سوائے اس کے کہ صرف اس حقیقتِ واقعی کے پیش نظر کہ چونکہ ایک ایسے ملک میں جس کے باشندوں کی عظیم اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو' اسمبلی یا پارلیمنٹ میں غیر مسلموں کی تعداد بہرصورت آٹے میں نمک کے برابر ہو گی لہٰذا وہ کسی طرح مؤثر نہیں ہو سکتے' یہ خیال کیا جائے کہ محض دنیا کو دھوکہ دینے کی خاطر انہیں بھی نیشنل اسمبلی یا پارلیمنٹ میں شرکت کا موقع دینے میں کوئی حرج نہیں ہے! تاہم یہ معاملہ ''گندم نمائی اور جو فروشی'' کے مترادف ہے جو اسلامی ریاست کے اعلیٰ اور ارفع اخلاقی تصورات کے ساتھ کوئی میل نہیں کھاتا۔

مزید برآں' حقیقت کے اعتبار سے اسلامی ریاست میں قانون سازی کا معاملہ ''حق'' نہیں' ایک نازک ''ذمہ داری'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصل نوعیت ''اجتہاد'' کی ہے جس کے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کرنے کے لئے ایمان کے بھی صرف زبانی اقرار کی نہیں توحید' معاد اور رسالت پر گہرے ''یقین'' کی ضرورت ہے' تو جو لوگ زبانی اقرار تک سے محروم ہوں اُن پر اِس عظیم ذمہ داری کا بوجھ کس طرح ڈالا جا سکتا ہے؟ اور ان سے یہ توقع منطق کے کس اصول یا قاعدے کے تحت رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کسی زیرِ غور مسئلے میں کتاب و سنت کے اصل منشأ اور حقیقی مقصد کو معین کرنے میں مقدور بھر سعی و جہد کا حق ادا کر سکیں گے؟

۲) ثانیاً کسی نظریاتی ریاست کی اعلیٰ ترین پالیسی کی سطح پر اوّلین ترجیح اس

© rasailojaraid.com

نظریئے کے فروغ اور عالمی سطح پر اس کی نشر و اشاعت کو حاصل ہوتی ہے جس پر اس کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین کی حکومت اور قیادت پر چینی کمیونسٹوں کا اوّلین الزام ہی یہ تھا کہ اس نے مارکسی نظریئے کی علمبرداری اور اس کے عالمی سطح پر فروغ کو پسِ پشت ڈال کر ''روسی نیشنلزم'' کی راہ اختیار کر لی ہے۔ تاہم یہ صرف ایک ''تشبیہہ'' ہے' دلیل نہیں۔ اس لئے بھی کہ اب خود چین بھی ''زوالِ علم و عرفاں'' کی اسی کیفیت سے دوچار ہو چکا ہے' اور اس لئے بھی کہ ہمارے لئے اصل دلیل قرآن اور حدیث ہیں' جنہیں کبھی کوئی زوال نہیں آ سکتا۔ بہرحال قرآن و حدیث دونوں کی رُو سے کسی بھی اسلامی ریاست کی پالیسی کی ترجیح اوّل ہی نہیں' اس کا عین مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر اللہ کے دینِ حق کا بول بالا کرنے کے اس مشن کی تکمیل کے لئے بروئے کار لایا جائے جس کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو' نہ اس کے دین کی حقانیت پر اور نہ رسول اللہ ﷺ پر یقین رکھتا ہو' نہ ان کے مشن اور مقصدِ بعثت پر' اس سے کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو اسلامی ریاست کے اس مقصدِ وجود کی تکمیل تو کجا اس کی اس ترجیحِ اوّل کی تقویت تک کے لئے صَرف کرے گا' اِلّا یہ کہ خود اپنے عقیدے اور نظریئے کے ساتھ اس کا تعلق ''منافقانہ'' ہو اور وہ حقیقی اور باطنی طور پر مومن و مسلم ہو۔ بصورتِ دیگر اگر وہ واقعی اور حقیقی اعتبار سے کسی اور عقیدے اور نظریئے کا قائل ہو تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری اور ارادی یا غیر ارادی طور پر اسلامی ریاست کے اس مقصدِ اعلیٰ کے خلاف کام کرے! اور واقعہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس پوزیشن میں لا کھڑا کرنا خود اس پر ''ظلم'' ہے۔ (چنانچہ فی الوقت پاکستان کے دستور میں یہ تضاد موجود ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے غیر مسلم ارکان سے بھی حلف لیا جاتا ہے کہ ''میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اسلامی آئیڈیالوجی کو برقرار رکھوں جو پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے!'')

۳) اسی اصول کے ''عکس'' (Converse) یا منطقی فرع (Corollary) کی

© rasailojaraid.c

© rasailojaraid.c

حیثیت سے، ایک نظریاتی ریاست ہونے کے ناطے اسلامی ریاست میں کسی کو اس کے اساسی نظریئے پر حملہ کرنے اور اس کے برعکس عقائد و نظریات کے پرچار کی اجازت بھی نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے کہ اس کی تو اساس اور بنیاد ہی اس نظریئے پر قائم ہوتی ہے، اور اس نظریئے کے ضعف کا منطقی نتیجہ خود ریاست کا ضعف و اضمحلال ہے۔ بنابریں اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو خود اپنے لوگوں میں اپنے عقائد و خیالات کی تبلیغ و تلقین اور اپنی آئندہ نسلوں کی اپنے نظریات کے مطابق تعلیم و تربیت کا حق تو حاصل ہوتا ہے، مسلمانوں کو تبلیغ کی اجازت نہیں ہوتی۔

ان تین معاملات کے سوا، باقی جملہ بنیادی حقوقِ شہریت کے اعتبار سے اسلامی ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا۔ یعنی:

۱) اسلامی ریاست بلا لحاظ رنگ و نسل اور بلا امتیاز مذہب و مسلک اپنے ہر شہری کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ''ذِمہ'' لیتی ہے۔

۲) اسی طرح ہر شہری کو عقیدے، مذہبی عبادات اور معاشرتی رسومات کی کامل آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور جملہ عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے۔

۳) شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ کے علاوہ قانونِ وراثت سمیت ''شخصی قوانین'' کے ضمن میں بھی کامل آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔

۴) اور ان سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلامی ریاست اپنے ہر شہری کی بنیادی معاشی ضروریات کی کفالت کا بھی ''ذمہ'' لیتی ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ (خاص اس موضوع پر مفصّل گفتگو، اِن شاء اللہ نظام اسلامی کی معاشی اور اقتصادی ترجیحات کے ضمن میں ہوگی۔)

واضح رہے کہ یہاں ''ذمہ'' کا لفظ بار بار اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ ''ذمی'' کی اسلامی اصطلاح کی اصل حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ ہرگز نہ کوئی گالی ہے، نہ کسی بھی درجہ میں تحقیر آمیز لفظ، جیسا کہ اسلام کے دشمنوں نے اسے بنا دیا ہے تاکہ مسلمانوں کی نوجوان نسل کو خود اپنے آپ، اپنے ماضی اور اپنی دینی اصطلاحات سے بیگانہ ہی نہیں،

© rasailojaraid.

© rasailojaraid.

متنفر بنا دیا جائے۔ اس لئے کہ شہریت کے ان چار بنیادی حقوق کے اعتبار سے جن کا تذکرہ اوپر ہوا ہے اسلامی ریاست کا ہر شہری، خواہ مسلم ہو خواہ غیر مسلم، ریاست کا ''ذمی'' ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی اکرم ﷺ نے کسی انسان کے مسلمان قرار دیئے جانے کی شرائط و صفات کے تذکرہ کے بعد فرمایا ہے کہ:

((فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَہٗ ذِمَّۃُ اللّٰہِ وَذِمَّۃُ رَسُوْلِہٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰہَ فِیْ ذِمَّتِہٖ))

''ایسا شخص وہ مسلم ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ ہے، پس اللہ کے اس ذمہ کی خلاف ورزی کر کے اللہ کی تحقیر کے مرتکب نہ بنو!''

تاہم شریعت اسلامی میں ''ذمی'' کی اصطلاح اس کے غیر مسلم شہریوں کے لئے اس لئے مخصوص کر دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست اپنی متذکرہ بالا چار بنیادی ذمہ داریوں میں تو ان کو مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک کرتی ہے۔ مزید برآں، تجارت، صنعت و حرفت اور سرکاری محکموں میں ملازمت کے دروازے بھی ان کے لئے مساوی طور پر کھولتی ہے اور دنیاوی ترقی کے جملہ مواقع یکساں طور پر فراہم کرتی ہے، تاہم قانون سازی اور ریاست کے بلند ترین مقصد یعنی کل روئے ارضی پر اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے تن من دھن لگا دینے کی ذمہ داری کا ''بوجھ'' ان پر نہیں ڈالتی۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ اسلامی ریاست کے ضمن میں ذمی ہی کی طرح ''جزیہ'' کی اصطلاح کو بھی گالی بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی ''جزا'' سے ماخوذ ہے اور ''بدلِ اشتراک'' کی حیثیت سے بالکل ٹیکس کے ہم معنی ہے۔ اس لئے کہ ہر ریاست اپنے شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت (اور ایک فلاحی ریاست میں اس سے بھی بڑھ کر بنیادی معاشی ضروریات کی کفالت) کا جو ذمہ لیتی ہے اس کے لئے وسائل کی فراہمی کے لئے شہریوں سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کرتی ہے، لیکن ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں سے وصول کیا جانے والا سب سے بڑا ''ٹیکس'' زکوٰۃ ہے، جو عبادات میں شامل ہے، لہٰذا ''جزیہ'' کی اصطلاح صرف غیر مسلم

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid

شہریوں سے وصول کیئے جانے والے ٹیکس کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عہد حاضر میں جملہ مسلمان ممالک میں بھی جہاں زکوٰۃ کا نظام قائم نہیں بلکہ دنیا کے عام رواج کے مطابق مختلف قسم کے ٹیکسوں ہی کا نظام رائج ہے گویا مسلم اور غیر مسلم سب ''جزیہ'' ادا کر رہے ہیں!)

حاصلِ بحث یہ کہ عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست میں وطنی قومیت کے نظریئے کو صرف انتظامی اور بالخصوص غیر ملکی سفر کے ضمن میں پاسپورٹ کے اجراء کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے' لیکن ریاست کی اصل اساس ''مسلم قومیت'' پر قائم ہو گی جس میں مقنّنہ اور عدلیہ کی بلند ترین سطح پر غیر مسلموں کی شرکت اور شمولیت خارج از بحث ہے۔

اس مرحلے پر مختصر گفتگو اس موضوع پر بھی ہو جائے تو مناسب ہے کہ اگرچہ خالص اصولی اعتبار سے تو جدید اسلامی ریاست کے لئے پارلیمانی اور صدارتی طرزِ حکومت کو بالکل یکساں طور پر مباح کی حیثیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے' تاہم عملی اعتبار سے صدارتی نظام زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ خلافتِ راشدہ کے نظام کے قریب تر ہے' اور اس لئے بھی کہ اس میں سربراہِ ریاست اور سربراہِ حکومت کی ثنویت سے پیدا ہونے والی کوئی پیچیدگی موجود نہیں ہوتی۔ پھر اس لئے بھی کہ اس میں ریاست کے تین اعضائے رئیسہ ممکنہ حد تک علیحدہ علیحدہ متشخص اور متعیّن ہوتے ہیں (جبکہ پارلیمانی نظام میں مقنّنہ اور انتظامیہ گڈمڈ ہو جاتی ہیں!) اور سب سے بڑھ کر اور آج کی بحث کے اعتبار سے اہم ترین' یہ کہ اس میں غیر مسلموں کی شرکت اور شمولیت کا معاملہ واضح طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ یعنی جہاں وہ مقنّنہ میں سرے سے شامل نہیں کیے جا سکتے' وہاں انتظامیہ اور عدلیہ کی صرف اعلیٰ ترین سطح کے سوا ان کی ہر سطح پر شمولیت ہو سکتی ہے۔ یعنی صدرِ مملکت یا ''خلیفۃ المسلمین'' کا عہدہ تو ظاہر ہے کہ صرف مسلمان کے لئے مختص ہو گا' اور صرف مسلمانوں ہی کے ووٹوں کی بنا پر وجود میں آئے گا' لیکن اس کے نیچے وزراء تک جو صدارتی نظام میں مقنّنہ کے منتخب ارکان میں سے نہیں بلکہ صرف ذاتی قابلیت اور فنی مہارت کی بنا پر مقرر کیے جا سکتے ہیں غیر مسلموں میں سے لئے جا سکتے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہیں۔ اسی طرح صرف بلند ترین عدالت تو چونکہ مقننہ کے ''اجتہاد'' کے ضمن میں اس فیصلے کی مجاز ہو گی کہ یہ جزوی یا کُلی طور پر قرآن و سنت کے حدود سے متجاوز ہے یا نہیں' لہٰذا اس کے جج تو لامحالہ صرف مسلمان ہی بن سکیں گے لیکن ماتحت عدالتیں چونکہ صرف مقننہ کے تدوین کردہ قوانین کے تحت فیصلے کرنے کی مجاز ہوں گی' لہٰذا ان میں غیر مسلموں کو بطور جج شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

البتہ پاکستان کے معروضی حالات کے پیش نظر صدارتی نظام کے اختیار کرنے میں یہ قباحت واقعتاً موجود ہے کہ موجودہ وفاقی اکائیاں یعنی صوبے آبادی کے اعتبار سے بہت غیر متوازن ہیں اور اس کی بنا پر چھوٹے صوبوں کے لوگوں کو اندیشہ ہو سکتا ہے کہ صدارتی نظام میں صدر ہمیشہ کسی ایک ہی بڑے صوبے سے ہو اور اس طرح چھوٹے صوبے گویا مستقل طور پر ''غلام'' بن جائیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک میں اس قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہرگز مشکل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ پاکستان کے موجودہ صوبوں کا تعین اور ان کی حد بندی انگریزوں نے اپنی انتظامی سہولتوں اور مصلحتوں کے پیشِ نظر کی تھی۔ اور اب جبکہ پاکستان کے پورے دستوری اور سیاسی ڈھانچے کے ضمن میں ایک نئے ''سوشل کنٹریکٹ'' کی بات ہو رہی ہے ایسے نئے صوبوں کا قیام جن کی آبادی میں ایک حد تک برابری اور توازن پیدا ہو جائے نہایت آسان ہے۔ اور اگر کسی صوبے کے باشندوں کو تاریخی اور ثقافتی اسباب کی بنا پر اپنے صوبے کا نام اتنا محبوب ہو کہ وہ اسے کسی صورت میں تبدیل نہ کرنا چاہیں تب بھی ہمارے سامنے یہ مثال موجود ہے کہ امریکہ میں دو دو ریاستیں ایک ہی نام کی حامل موجود ہیں' جیسے نارتھ کیرولائنا اور ساؤتھ کیرولائنا اور نارتھ ڈکوٹا اور ساؤتھ ڈکوٹا وغیرہ۔ اور اس ضمن میں آخری بات یہ کہ جہاں انسان کے اب تک کے عمرانی ارتقاء کی بلند ترین صورت ایک جانب صدارتی جمہوری نظام ہے اور دوسری جانب وفاقی نظام حکومت' وہاں روحِ عصر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وفاقی اکائیاں حجم میں چھوٹی ہوں اور انہیں زیادہ سے زیادہ داخلی خود مختاری دی جائے۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.